شبیر احمد خاں غوری

علمِ کلام کا آغاز و ارتقاء

(۶)

عہدِ آخر ——— ہندوستان

طوائف الملوکی

محمد تغلق نے ۷۵۲ھ میں وفات پائی۔ اُس کے جانشین فیروز تغلق نے ان فارق المرکز قوتوں کا مقابلہ کرنے کی ان تھک کوشش کی جو محمد تغلق کی غیر دانشمندانہ پالیسی کے نتیجے میں ظہور میں آرہی تھیں مگر قسمت کے آگے کسی کی پیش نہیں جاتی۔ قصرِ سلطانی کے دروازے پر حق گو علماء کا جو خون بہایا گیا تھا اُسے رنگ لانا تھا اور وہ رنگ لاکر رہا۔ وہ عظیم الشان سلطنت جو محمد تغلق نے خلجی حکمرانوں سے ورثہ میں پائی تھی کچھ ہی عرصے میں پارہ پارہ ہوگئی اور فیروز تغلق کے جانشینوں کا اقتدار دہلی اور مضافاتِ دہلی میں محدود ہوکر رہ گیا اور یہاں بھی وہ اپنے محسن کش وزراء سے مامون نہیں تھے اور جان بچانے کے لیے بھاگتے پھرتے تھے۔ یہاں تک کہ ۸۰۰ھ میں تیمور نے حملہ کرکے اس ظاہری پردے کو بھی چاک کردیا۔ ہر طرف انتشار و پراگندگی پیدا ہوگئی۔ ملک مختلف صوبوں میں تقسیم ہوگیا۔ ہر صوبے کا حاکم خود مختار بن بیٹھا۔ دہلی کی مرکزیت ختم ہوگئی۔ تیمور جاتے وقت سید خضر خاں کو دہلی کا حاکم بنا گیا جہاں اس کے خاندان نے ۸۵۴ھ تک حکومت کی۔ اس کے بعد لودھی حکمرانوں کا دور دورہ شروع ہوا جو ۹۳۳ھ تک قائم رہا جب کہ بابر نے آخری لودھی سلطان ابراہیم کو شکست دے کر مغلیہ سلطنت کا افتتاح کیا۔

دہلی پر محمد تغلق کی علماء کشی کا وبال نحوست بن کر عرصے تک چھایا رہا اور تیموری قتل و غارت سے بھی اس کا کفارہ نہ ہوسکا۔ علمائے نامدار جن کے وجود مسعود نے دہلی کو عروس البلاد بنا دیا تھا ایک ایک کرکے پردیس کی راہ اختیار کرنے پر مجبور ہوئے۔ لیکن تغلق حکمرانوں کی کمزوری اور تیمور کے حملے نے جو ملک میں بہت سی چھوٹی چھوٹی حکومتیں قائم کردی تھیں اُس کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ ہر سلطنت اپنی جگہ علم و ادب کی سرپرستی کے لیے کوشاں تھی۔ ان نئی حکومتوں میں سب سے پہلے دکن کی بہمنی حکومت کی بنیاد پڑی جہاں حسن گنگو بہمنی کے خاندان نے ۷۴۸ھ سے ۹۳۴ھ تک حکومت کی تا آنکہ بہمنی امراء نے ملک کو پانچ حصوں میں بانٹ لیا۔ ۷۹۶ھ میں جونپور کی حکومت کا آغاز ہوا جہاں کچھ دن بعد شرقی خاندان نے خود مختاری کا اعلان کردیا اور ۸۸۱ھ تک پورب میں حکومت کرتے رہے۔ مالوہ اور مندو کی مستقل حکومت ۸۳۸ھ

سے ۸۷۹ھ تک قائم رہی۔ گجرات کی سلطنت ۷۹۳ھ سے ۹۹۱ھ تک باقی رہی۔ ان کے علاوہ خاندیش، بنگال، سندھ، ملتان اور مالابار میں بھی مقامی حکومتیں قائم ہوگئیں۔ یہ سلاطین علماء و فضلاء کی تربیت میں بھی ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ ان میں خصوصیت سے جونپور قابلِ ذکر ہے جو مشرق کا شیراز کہلاتا تھا۔ آزاد بلگرامی نے لکھا ہے:

دار الجبور جونپور . . . بلدۃ عظیمۃ من صوبۃ الہ آباد کانت دار خلافۃ السلاطین الشرقیۃ وذکر طبقتھم مسطور فی تواریخ الھند نشا بھا کثیر من المشائخ والعلماء۔[۵۱]

دار الجبور (علماء کا دیس) جونپور . . . . صوبہ الہ آباد کا ایک بڑا شہر ہے۔ شرقی بادشاہوں کا دار السلطنت تھا۔ ان کے خاندان کا ذکر ہندوستان کی تاریخوں میں مذکور ہے۔ اکثر مشائخ و علماء یہاں پیدا ہوئے۔

سلاطین جونپور میں ابراہیم شاہ شرقی (۸۰۴-۸۴۴)، محمود شاہ شرقی (۸۴۴-۸۶۲) اور حسین شاہ شرقی (۸۶۲-۸۸۱) کے نام علم و ادب کی سرپرستی کے لیے خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ ابراہیم شاہ شرقی کے بارے میں فرشتہ لکھتا ہے:

"شاہے بود متصف بعقل و دانش و تدبیر۔ در عصر دے فضلائے ممالک ہندوستان و دانشمندان ایران و توران کہ از آشوب جہان پریشان خاطر بودند بدار الامان جونپور آمدہ در مہد امن و امان غنودند و از خوان احسان زلہا برداشتہ بنام نامی او چنانچہ بزبان قلم خواہد آمد چندیں کتب و رسائل پرداختند . . . . مردم از اطراف و اکناف ہندوستان کہ مشحون از خلل شدہ بود روئے بجونپور آوردہ ہریک فراخور مرتبت و حالت نوازش می یافتند و از خادم و مشائخ و علماء و سادات و نویسندہ از ہر حیثیت بجائے رسید کہ جونپور را دہلی ثانی میگفتند۔"[۵۲]

ابراہیم شاہ شرقی کے عہد کا خاص کارنامہ "فتاوائے ابراہیم شاہی" کی تدوین ہے۔ حسین شاہ شرقی خود جید عالم تھا۔ اُس نے قاضی سماء الدین جونپوری سے علم حاصل کیا تھا۔

جن لوگوں نے فتنۂ تیموری میں دہلی سے جونپور کی طرف رحلت فرمائی اُن میں قاضی عبد المقتدر شریحی کے پوتے شیخ ابو الفتح بھی تھے جنہیں فقہ اور اُصول و کلام میں دستگاہ عالی حاصل تھی۔ ابو الفتح کے شاگرد شیخ فخر الدین بجوری لکھنوی تھے۔ لیکن سب سے زیادہ شہرت قاضی شہاب الدین دولت آبادی کو حاصل ہوئی۔ وہ مولانا خواجگی کے شاگرد تھے۔ مولانا خواجگی مولانا معین الدین عمرانی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ اور آٹھویں صدی کے مشاہیر علماء میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ تیمور کے حملہ دہلی سے پہلے اپنے شاگرد رشید قاضی شہاب الدین دولت آبادی کے ہمراہ دہلی چھوڑ کر نکل کھڑے ہوئے۔ مولانا خواجگی کالپی میں ٹھہر گئے مگر قاضی شہاب الدین جونپور چلے گئے جہاں سلطان ابراہیم شاہ نے انہیں خطاب "ملک العلماء" سے نوازا۔ آزاد بلگرامی نے لکھا ہے

"و قاضی جانب جونپور رفت۔ سلطان ابراہیم شرقی اشرقہ اللہ ضریحہ مقدم او را مغتنم دانستہ لوازم قدر شناسی افزوں از وصف

---

۵۱ سبحۃ المرجان صفحہ

۵۲ تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۰۵، ۳۰۶

بجا آورد و مخطاب ملک العلمائی بلند آوازہ ساخت"[۱]

فرشتہ نے قاضی شہاب الدین کے بارے میں لکھا ہے:

"از جملہ فضلائے عصر او یکے قاضی شہاب الدین جونپوری است۔ اصل او از غزنیں است و در دولت آباد دکن نشوونما یافت۔ سلطان ابراہیم در تعظیم و توقیر او بسیار می کوشید و در روز ہائے متبرک در مجلس او بر کرسی نقرہ می نشست۔ می گویند وقتے مولانا را مرضے طاری شد سلطان ابراہیم بعیادت او رفتہ بعد از تفتیش احوال و اظہار لوازم مہربانی قدحے را پُر از آب کردہ گرد مولانا گردانید و خود نوشید گفت بار خدایا ہر بلائے کہ در راہ او باشد نصیب من گرداں و او را شفا بخش۔ وازینجا عقیدہ آں صاحب تخت و تاج بسبت علمائے شریعت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم معلوم تواں کرد تا چہ غایت بود"[۲]

قاضی شہاب الدین کے ورود مسعود سے جونپور مشرق کا شیراز بن گیا۔ جن نفوس قدسیہ نے اُن سے کسب فیض کیا اُن میں اُن کے نواسے شیخ صفی بن نصیر ردولوی ہیں۔ شیخ صفی کے صاحبزادے اسمٰعیل تھے جن کے واسطے قاضی شہاب الدین نے صرف میں "دستور المبتدی" اور حاشیۂ کافیہ بنام "غایۃ التحقیق" تصنیف کیا۔ دوسرے نواسے شیخ رضی الدین بھی ان کے شاگرد تھے انہیں فقہ و عربیۃ اور اصول و کلام میں کمال حاصل تھا۔ تیسرے نواسے اور شاگرد مولانا فخر الدین جونپوری تھے۔ شیخ صفی کے پوتے شیخ عبد القدوس گنگوہیؒ متبع سنت اور عالم حیدؒ تھے انہوں نے علم کلام کی متداول کتاب "شرح الصحائف" پر تعلیقات لکھی تھیں۔ نیز عوارف المعارف اور المتعرف کی شروح لکھی تھیں۔ ان کے علاوہ ایک اور کتاب "انوار العیون و اسرار المکنون" بھی ان سے یادگار ہے۔ اس زمانہ میں وحدت الوجود کا بڑا زور تھا اور شیخ عبد القدوس گنگوہی بھی اس کے سرگرم مبلغ تھے۔ اُن کے صاحبزادے بھی اس کے قائل تھے مگر پوتے شیخ عبد النبی اس کے منکر تھے اور اسی لیے ناراض ہوکر اُن کے والد نے اُنہیں گھر سے نکال دیا تھا۔ قاضی شہاب الدین کے دیگر تلامذہ میں سماء الدین جونپوری (وزیر قتلغ خاں) مولانا عبد الملک جونپوری (جو مدرسہ میں اُستاد کے جانشین ہوئے اور جنہوں نے قاضی شہاب الدین کی شرح کافیہ پر حاشیہ لکھا)، مولانا علاء الدین جونپوری (جن کے واسطے قاضی شہاب الدین نے شرح کافیہ لکھی تھی)، قطب الدین ظفر آبادی، شیخ محمد بن عیسٰی جونپوری (جن کے واسطے قاضی شہاب الدین نے اُصول بزدوی کی شرح لکھی تھی)، محمد بن ابی البقا کرمانی (جو فقہ میں تبحر کی وجہ سے امام اعظم ثانی کہلاتے تھے) وغیرہم تھے۔ مولانا عبد الملک جونپوری کے شاگرد شیخ الہداد بن عبد اللہ جونپوری تھے جو اپنے زمانہ میں نحو اور فقہ و اصول فقہ میں سر آمد فضلائے روزگار سمجھے جاتے تھے انہوں نے قاضی شہاب الدین کی شرح کافیہ پر حواشی کے علاوہ مدارک التنزیل، ہدایۃ الفقہ اور اُصول بزدوی پر بھی حواشی لکھے تھے۔

---

[۱] تذکرہ مآثر الکرام صفحہ ۱۸۸ [۲] تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۰۶

ان کے علاوہ باہر سے علماء مشاہیر نے آکر بھی جونپور کی علمی عظمت ورفعت کو بڑھایا مثلاً خضر بن الحسن البلخی، قاضی نظام الدین غزنوی اور ان کے صاحبزادے سناء الدین غزنوی وغیرہم۔ دیگر علماء میں جنہوں نے جونپور کو مشرق کا شیراز بنایا قاضی احمد بن محمد جونپوری (مصنف فتاوائے ابراہیم شاہی) اور ان کے پوتے اور شاگرد قاضی صلاح الدین جونپوری، قاضی نصیر الدین جونپوری (شاگرد قاضی عبدالمقتدر شریحی)، قاضی تاج الدین ظفر آبادی، اور مولانا قیام الدین ظفر آبادی وغیرہ مشہور ہیں۔ ایک اور بزرگ مولانا محمد بن حسن جونپوری تھے جن کے شاگرد مولانا عبدالرزاق جھنجھانوی اور مولانا عبدالملک پانی پتی وحدت الوجود کے مسئلہ میں مناظرے کے سلسلے میں مشہور ہیں۔ جونپور ہی سے سید محمد جونپوری کا نام وابستہ ہے جو مہدویت کے مدعی اور فرقۂ مہدویہ کے پیشوا و بانی تھے وہ جونپور میں ۸۴۷ھ میں پیدا ہوئے۔

لیکن اس عہد کی سب سے بارونق اسلامی سلطنت گجرات تھی جس کی بنیاد ۷۹۳ھ میں پڑی تھی اور ۹۹۱ھ تک باقی رہی۔ علم وادب کی سرپرستی میں بھی سلاطین گجرات نے خدمات شائستہ انجام دیں۔ ان میں سلطان احمد شاہ گجراتی (۸۱۴ - ۸۴۵)، محمود بیگڑہ (۸۶۲ - ۹۱۷) اور مظفر شاہ گجراتی (۹۱۷ - ۹۳۲) کے نام خاص طور سے مشہور ہیں۔ احمد شاہ کے لطفِ عمیم نے اقصائے عالم سے علماء کرام کو کھینچ لیا تھا جن میں شیخ بدر الدین بن ابی بکر دمامینی شارح صحیح بخاری خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ محمود شاہ بیگڑا نے مصطفیٰ آباد کو آباد کر کے حنفی مسلک کے مطابق وہاں کی آبادی کی تعلیم کا انتظام کیا۔ اُس کا جانشین مظفر شاہ خود بڑا متشرع و متورع اور متبع سنت تھا۔ اُس کے زمانہ میں اکثر شرفاء و علمائے ایران شاہ اسمٰعیل صفوی کی چیرہ دستیوں سے پریشان ہو کر گجرات آئے۔ فرشتہ لکھتا ہے:

"سلطان مظفر پادشاہے بود بغایت متشرع و متورع و تتبع احادیث نبوی بسیار کردے۔ خط نسخ و ثلث و رقاع نیکو می نوشت و پیوستہ کتابت مصحف مجید کردے و چوں تمام شدے بحرمین الشریفین فرستادے و اکابر و اشراف ایران و توران و روم و عربستان در عہد وے بگجرات آمدند و فراخور حال نوازش یافتند[۱]"

سلطنت گجرات کا خاص کارنامہ "فتاوائے حمادیہ" کی تدوین ہے جو قاضی حماد الدین گجراتی کے ایماء سے مفتی رکن الدین ناگوری اور ان کے صاحبزادے مفتی داؤد نے مرتب کیا۔ قاضی حماد کے والد محمد اکرم بھی اپنے عہد کے افاضل میں سے تھے اور فقہ میں امام اعظم ثانی سمجھے جاتے تھے۔ یہ دونوں باپ بیٹا نہروالہ کے قاضی القضاۃ تھے۔ دیگر علماء میں شیخ تاج الدین نہروالی، شیخ حسین بن محمد بھڑوچی، شیخ حسن بن محمد گجراتی، شیخ سراج الدین گجراتی، قاضی علی

---

[۱] تاریخ فرشتہ جلد دوم صفحہ ۲۱۲

بن عبدالملک گجراتی، قاضی علم الدین شاطبی، مولانا قاسم بن محمد گجراتی، شیخ کبیرالدین ناگوری، شیخ محمد بن حسین پٹنی، شیخ محمود بن محمد گجراتی زیادہ مشہور ہیں۔ شیخ محمود بن محمد کے شاگرد شیخ راجح بن داؤد گجراتی تھے جو اپنے وقت کے محدث تھے۔ شیخ راجح بن داؤد نے مولانا محمد بن تاج گجراتی سے ہیئت اور علم کلام کی تکمیل کی تھی۔ محمد بن تاج گجراتی کو اُن کے علم وفضل سے متاثر ہوکر سلطان مظفر شاہ گجراتی نے "تاج العلماء" کا لقب دیا تھا۔ ان کے علاوہ مولانا حبیب اللہ گجراتی، مولانا شمس الدین محمد بن محمد گجراتی، مولانا صدر جہاں گجراتی، ملا داؤد گجراتی (مصنف تحفۃ السلاطین) اور مولانا عبدالکریم مصنف "طبقات محمود شاہی" قابل ذکر ہیں۔ عرب وعجم کے علماء نے بھی آکر دربار گجرات کی زیب وزینت میں اضافہ کیا تھا۔ ان میں شیخ بدرالدین بن ابی بکر دمامینی کا نام خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔ وہ شراح بخاری کے درمیان ایک نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ مصابیح الجامع شرح صحیح بخاری کے علاوہ انہوں نے مصابیح الجامع کی شرح بنام "تحفۃ الغریب" تسہیل ابن مالک اور خزرجیہ کی شروح، حیاۃ الحیوان دمیری کا اختصار اور صغدی کی شرح مغنی اللبیب پر تبصرہ بھی لکھا اور ان میں سے اکثر کتابوں کو احمد شاہ گجراتی کے نام پر معنون کیا۔ باہر سے آنے والے علماء میں شیخ محمد بن عمر بحرق الحضرمی، قاضی اسمٰعیل اصفہانی اور شیخ غوث الدین بغدادی بھی تھے۔

ان کے علاوہ محقق دوانی کے شاگردوں میں سے ابوالفضل گازرونی، ابوالفضل استرآبادی اور ملا عماد طارمی نے آکر معقولات کی گرم بازاری کی۔ ملا عماد طارمی کے شاگرد رشید مولانا وجیہ الدین علوی گجراتی تھے۔ ایک اور زبردست معقولی شیخ ہبۃ اللہ شیراز سے تشریف لائے تھے انہوں نے حدیث اپنے نانا حافظ نورالدین ابی الفتوح طاؤسی سے پڑھی تھی اور معقولات کی تکمیل انہیں اساتذہ سے کی تھی جن کے فیض تربیت نے صدرالدین شیرازی سے "اسفار اربعہ" وغیرہ لکھوائیں۔ وہ ۸۹۸ھ میں بعہد سلطان محمود بیگڑہ تشریف لائے اور چاپانیر میں مقیم ہوگئے جہاں تھوڑے ہی عرصے میں طلبۂ علم نے دور دراز شہروں سے آکر انہیں گھیر لیا۔

گجرات ہی کے باشندے سید خوندمیر گجراتی تھے جو فرقہ مہدویہ کے سرگرم مبلغ اور اُن کے متکلم تھے۔

اس عہد کی دوسری باشوکت سلطنت دکن کی بہمنی حکومت تھی جس کا آغاز ۷۴۸ھ میں حسن گنگو بہمنی نے کیا تھا اور جو ۹۳۴ھ تک باقی رہی جب کہ محسن کش اُمراء نے اپنے آخری ولی نعمت کو تاج وتخت سے محروم کرکے اس وسیع سلطنت کو پانچ حصوں میں بانٹ لیا۔ بہمنی سلاطین نے بھی علم وادب کی سرپرستی میں اپنے معاصرین سے کم حصہ نہیں لیا۔ ان بادشاہوں میں محمود شاہ بہمنی (۷۸۰-۷۹۹)، فیروز شاہ بہمنی (۸۰۰-۸۲۵) احمد شاہ بہمنی (۸۲۵-۸۳۸) اور علاء الدین بہمنی (۸۳۸-۸۶۲) علم وفضل کی سرپرستی کے لیے خصوصیت سے مشہور ہیں۔ محمود شاہ کے بارے میں فرشتہ لکھتا ہے:

"از علوم متداولہ باخبر بود۔ فارسی وعربی را فصیح می گفت وبا علماء مجالست نمودہ کما ینبغی رعایت خاطر ایشاں می نمود ودر عہد

خجستہ وے شعرائے عرب و عجم بدکن آمدہ از سرچشمہ انعام و احسانش مستفید می گردیدند ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ از برائے یتیماں در گلبرگہ ۔ ۔ ۔ و دیگر شہرہا و قصبہ ہائے بزرگ معلماں نشاندہ اخراجات معین کردہ جہت محدثاں اخبار حضرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم در شہرہائے کلاں وظائف مقرر کردہ و در تعظیم ایشاں می کوشید۔[1]"

محمود شاہ نے ملا محمد قاسم مشہدی کے ہاتھ خواجہ حافظ کو تحائف بھی بھیجے تھے۔ فیروز شاہ بہمنی اپنے عہد کا جید عالم تھا اس نے علامہ تفتازانی کے شاگرد رشید میر فضل اللہ انجو سے علوم متداولہ کی تکمیل کی تھی۔ باوجود مشاغل حکومت کے ہفتہ میں تین دن مختلف علوم کی کتب مطولات کا درس دیتا تھا۔ فرشتہ لکھتا ہے

"در اکثر علوم خصوصاً تفسیر و اصول و حکمت طبعی و نظری مہارت تمام داشت و از اصطلاحات صوفیہ باخبر بود و در ہفتہ سہ روز شنبہ و دوشنبہ و چہارشنبہ درس می گفت بدیں تفصیل زاہدی و شرح تذکرہ در ریاضی و شرح مقاصد در کلام و تحریر اقلیدس در ہندسہ و مطول ملا سعدالدین ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ و از برکت میر فضل اللہ انجو کہ از شاگردان خوب ملا سعدالدین تفتازانی است آں شہنشاہ بے نظیر ایں ہمہ کسب حیثیت و فضیلت نمودہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دانش وے زیادہ از دانش محمد شاہ بود۔[2]"

اس نے بالاگھاٹ کے قریب دولت آباد میں رصدگاہ بنوانے کا بھی ارادہ کیا تھا مگر تعمیر نہ ہو سکی۔ اس علم و فضل کے باوجود اس کے عہد کا یہ کارنامہ بھی ناقابل فراموش ہے کہ اس نے میر فضل اللہ انجو کے ایماء سے متعہ کو جو جملہ مذاہب اہل سنت میں حرام ہے اپنی عیش کوشی کے لیے جائز قرار دیا۔ فیروز شاہ کو معزول کر کے اس کا بھائی احمد شاہ تخت نشین ہوا۔ اس نے بھی اپنے معزول بھائی کی طرح علم و علماء کی تربیت و سرپرستی کو جاری رکھا۔ فرشتہ لکھتا ہے:

"پیروی برادر بزرگوار نمودہ و در تعظیم سادات و علماء و مشائخ بہ تقصیرے از خود راضی نشدے۔[3]"

بہمنی عہد حکومت میں وزیر محمود گاواں کا نام بھی بحیثیت ایک عالم و مربی علماء کے مشہور ہے۔ فرشتہ اُن کے بارے میں لکھتا ہے:

"ذات شریف آں آصف جاہ بانواع علوم عقلیہ و نقلیہ خصوصاً ریاضی و طب اتصاف داشت و در فن نظم و نثر و انشا و حساب بے نظیر روزگار خویش بود۔[3]"

فن انشا میں اس کی کتاب "مناظر الانشا" اپنے موضوع پر بہترین کتاب ہے۔ طاشکبریٰ زادہ نے اس کی علماء نوازی کے سلسلے میں لکھا ہے:

وکان احسانہ یصل من الھند الی علماء الروم و فضلاء العجم۔[4]	محمود گاواں کے احسانات و انعامات ہندوستان سے روم کے علماء اور ایران کے فضلاء تک برابر پہنچتے تھے۔

اُس نے بیدر میں ایک عظیم الشان مدرسہ بھی بنایا تھا جس کی صدارت مولانا جامی کو پیش کی تھی مگر وہ دکن نہ آسکے۔ محمود گاواں

---

[1] تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۰۲ [2] ایضاً صفحہ ۳۰۸ [3] ایضاً صفحہ ۳۱۹ [4] مفتاح دار السعادہ طاشکبریٰ زادہ صفحہ

کی تعریف میں جامی کا یہ شعر مشہور ہے

ہم جہاں را خواجہ وہم فقر را دیباچہ است آیتِ الفقر ولکن تحت استاد الغنا

لیکن دکن کی رونق دیگر مقامی حکومتوں کی طرح شمالی ہند کی بے رونقی کی مرہونِ احسان ہے۔ انتشار و طوائف الملوکی نے جب دہلی اور پنجاب میں زندگی مشکل کر دی تو شمال کے اہل علم دکن جانے پر مجبور ہوئے۔ دہلی سے شیخ حسین بن محمدؒ، ملتان سے قاضی ابراہیم بن فتح اللہ اسی طرح منڈو سے مولانا عبدالغنی منڈوی دکن پہنچے۔ ایک دوسرا ملتانی خاندان مالا بار پہنچا جس کے مشہور رکن قاضی رکن الدین ملتانی تھے جو شہر کالی کٹ میں قاضی تھے۔ دوسرے مشاہیر میں عین الدین بیجاپوری، اُن کے صاحبزادے محمدؒ اور مولانا نجم الدین گلبرگوی قابل ذکر ہیں۔ شیخ عین الدین بیجاپوری حسن گنگو بہمنی کے معاصر اور "ملحقات" کے مصنف ہیں۔ فرشتہ لکھتا ہے

"واز جملہ علماء و مشاہیر کہ معاصر سلطان علاء الدین حسن بودند یکے شیخ عین الدین بیجاپوری است[۱]"

محمد بن عین الدین پہلے گلبرگہ کے مفتی اعظم تھے بعد میں بعہد فیروز شاہ شحنۂ حضرت مقرر ہوئے۔ مولانا نجم الدین کو عربی ادب اور فقہ و اصول میں دستگاہ کامل حاصل تھی۔ احمد شاہ نے ان کو مفتی لشکر بنایا تھا۔ تاریخ دکن میں مولانا نجم الدین کو اس بنا پر اور بھی اہمیت حاصل ہے کہ انہوں نے احمد شاہ بہمنی کو ہوشنگ شاہ والی منڈو پر حملہ کرنے سے صرف اصلاح بین المسلمین کی خاطر روک دیا تھا۔

مگر بہمنی فضلاء کی محفل کی آرائش ایران کے علماء سے زیادہ ہوئی۔ علامہ تفتازانی کے شاگرد میر فضل اللہ انجو حسن گنگو بہمنی کے زمانہ میں دکن آئے تھے۔ اُس نے انہیں اپنے لڑکوں کا اتالیق مقرر کیا۔ جب محمود شاہ تخت نشین ہوا تو اس نے میر فضل اللہ کو گلبرگہ کا صدر بنایا اور فیروز شاہ بہمنی نے انہیں وکیلدر بنایا۔ تفتازانی کے شاگرد کی حیثیت سے میر فضل اللہ معقولات و ریاضیات میں ید طولیٰ رکھتے تھے اور یہی ذوق فیروز شاہ نے جو اُن کا شاگرد تھا اُن سے اخذ کیا۔ جس کی تفصیل اور پرگزری اور اس کا نتیجہ تھا کہ اس نے ہلاکو اور الغ بیگ کی طرح رصدگاہ قائم کر کے نجوم و ہیئت کے علوم کو ترقی دینا چاہا، مگر یہ ارادہ حد تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ فرشتہ لکھتا ہے:

"در سنہ عشر و ثمان مائۃ سلطان فیروز شاہ کہ از علم ریاضی و ہندسہ وقوف تمام داشت و سرآمد علمائے زمانہ نزد وے جمع آمدہ بودند۔ حکم فرمود کہ در بالاگھاٹ دولت آباد رصد بندند۔ و دریں صورت حکیم حسن گیلانی و سید محمد گازرونی کہ بمزید دانش امتیاز داشتند باتفاق جمیع علماء بآں امر مشغول شدند۔ لیکن بنا بر بعضے امور کہ یکے از انجملہ فوت حکیم حسن گیلانی بود رصد تمام نشد و آں کار ناتمام ماند[۲]"

لیکن فضلائے دکن کی مجلس کی صدارت کے مستحق شیخ علاء الدین علی بن احمد المہائمی ہیں۔ اُن کی تفسیر "تبصیر الرحمٰن

---

[۱] تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۲۸۱ [۲] ایضاً صفحہ ۳۱۶

وتیسیر المنان" ہمارے تفسیری ادب میں خاص مقام رکھتی ہے۔ فن اسرار شریعت میں "انعام الملک العلام باحکام حکم الاحکام" لکھی۔ توحید میں "ادلۃ التائید فی شرح ادلۃ التوحید" ان کے رشحات قلم سے ظہور میں آئی۔ مسئلہ قضا و قدر کی تبیین و توضیح کے لیے "النور الاطہر فی کشف سر القضا والقدر" اور اس کی شرح "الضوء الازہر فی شرح النور الاطہر" لکھیں۔ ابن المطہر الحلی کی کتاب "استقصاء النظر" کے رد میں "استجلاء البصر فی رد علی استقصاء النظر" لکھی۔ تصوف سے خاص لگاؤ تھا اور ابن العربی کے معتقدین میں سے تھے اور فصوص الحکم کی شرح بنام "مشرع الخصوص فی شرح الفصوص" لکھی جو اپنے موضوع پر بے نظیر ہے۔ عوارف کی شرح "زوارف" کے نام سے لکھی۔ عراقی کے لمعات کا ترجمہ کر کے اس کی شرح لکھی۔ اسی طرح جام جہاں نما کا ترجمہ کر کے "آثار الدقائق فی شرح مرأۃ الحقائق" کے نام سے اُس کی شرح لکھی۔

وسط ہند میں مالوہ عرصہ تک اسلامی ثقافت کا مرکز رہا ہے یہاں دلاور خاں غوری نے ۸۰۹ھ میں سلاطین دہلی کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر مستقل بادشاہی کا اعلان کیا۔ یہ سلطنت جس کا صدر مقام مندو تھا ۹۷۳ھ تک قائم رہی جب کہ اکبر نے اسے فتح کر کے اپنی سلطنت میں ملا لیا۔ آخری تاجدار باز بہادر تھا جو ہندوستان کے رومانی ادب میں روپ متی کے عاشق کی حیثیت سے آج بھی مشہور ہے۔ سلاطین مالوہ میں محمود شاہ خلجی اور غیاث الدین خلجی علم و ادب کی سرپرستی کے لیے خاص طور سے مشہور ہیں۔ محمود شاہ کے بارے میں نظام الدین ہروی نے طبقات اکبری میں لکھا ہے:

"چوں سلطنت بروقرار گرفت ہمت بر تربیت فضلا و علماء گماشتہ و ہر جا ارباب کمال را می شنید زر ہا می فرستاد و طلب می داشت۔ و در ولایت خود چند جا مدرسہ ساختہ علماء را باطلبہ وظیفہ مقرر فرمود تا بافادہ و استفادہ مشغول گردیدند۔ بالجملہ بلاد مالوہ در ایام دولت او محسود شیراز و سمرقند شد۔"[1]

جونہی مالوہ کی مستقل حکومت قائم ہوئی علماء کے وفود آنا شروع ہو گئے۔ ہوشنگ شاہ کے عہد میں قاضی برہان الدین مالوی مندو تشریف لائے۔ محمود شاہ خلجی کی علماء نوازی نے جونپور سے حکیم شہاب الدین کرمانی کو کھینچ بلایا۔ انہوں نے ایک مبسوط تاریخ محمود شاہی تصنیف کر کے محمود شاہ کے نام معنون کی۔ مندو کے ایک اور عالم شیخ سعد اللہ لاری (المشہور بمندوی) تھے جو بلاد مالوہ میں ہر دلعزیز تھے۔ سلطان نے انہیں سید العلماء کا لقب دیا تھا۔ فرشتہ ان کی مقبولیت کے بارے میں لکھتا ہے:

"در سنہ اثنی و تسعمایۃ شیخ المحدثین والمفسرین قدوۃ المحققین شیخ سعد اللہ لاری المشہور بمندوی طومار حیاتش پیچیدہ شد ..... و خلائق آں بلدہ از مسلم و کافر حزین و غمگین شدند۔"[2]

ایک اور عالم و طبیب مولانا فضل اللہ حکیم تھے جنہیں محمود شاہ نے اپنے دار الشفا کا جسے ۸۴۹ھ میں تعمیر کرایا تھا صدر و مہتمم

---

[1] طبقات اکبری صفحہ ۵۴۶ [2] تاریخ فرشتہ صفحہ ۲۵۷

بنایا تھا۔ فرشتہ لکھتا ہے :

"ودر سنہ تسع واربعین وثمانمایہ دارالشفا طرح انداختہ چند موضع از برائے خرج ادویہ ومایحتاج بنابراں وقف نمود ومولانا فضل اللہ حکیم راکہ بخطاب حکیم الحکماء مخاطب بود براعات احوال مرضی ومجانین تعین نمود [1]"

مولانا عبدالغنی مندوسی کا ذکر فضلائے دکن کے سلسلے میں آچکا ہے وہ مندوہی کے باشندے تھے لیکن دکن چلے گئے جہاں احمد شاہ بہمنی نے بیدار کی صدارت تفویض فرمائی۔

شمالی ہندوستان میں ملتان شروع ہی سے اسلامی ثقافت کا مرکز اور قبۃ الاسلام رہا ہے۔لیکن جب اسلامی ہند کا صدر مقام لاہور اور بعد میں دہلی میں منتقل ہوا تو ملتان کی اہمیت کم ہوگئی۔ آٹھویں صدی کے نصف آخر اور نویں صدی کے انتشار و طوائف الملوکی نے اسے اور بھی دھکا پہنچایا۔ ارباب فضل وکمال بھی وطن چھوڑ کر نکلے چنانچہ اخبار الاخیار میں شیخ سماءالدین کے ذکر میں لکھا ہے :

"وازملتان بنابر بعضے وقائع کہ دراں دیار واقعہ شدہ برآمد [2]"

فیروز تغلق کے عہد میں ملتان کا حاکم ملک مروان دولت تھا۔ اُس کے بعد اُس کا بیٹا ملک شیخ حاکم ملتان ہوا۔ اس کے مرنے پر اس کا منہ بولا بیٹا ملک سلیمان حاکم ہوا۔ ملک سلیمان کے بعد فیروز نے اس کے بیٹے خضر خاں کو حاکم ملتان مقرر کیا۔مگر سارنگ خاں نے ۷۹۸ھ میں اسے بیدخل کر دیا۔ کچھ عرصے بعد تیمور نے حملہ کیا۔تلبنہ کے میدان میں لڑائی ہوئی اور تیمور نے تلبنہ کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور علماء و سادات کے سوا کسی کو نہ چھوڑا۔ جب دہلی و شمالی ہند کو برباد کر کے تیمور واپس جانے لگا تو خضر خاں کو ہندوستان کی حکومت دے گیا۔ اور تغلق خاندان کے زوال کے بعد خضر خاں دہلی کا بادشاہ ہوگیا اور اپنے بجائے علاءالملک کو ملتان و فتح پور کی جاگیر دی۔ اس کے بعد پنجاب کی تاریخ مقامی زمینداروں کی حوصلہ آزمائی اور سلاطین دہلی کی ناکام کوششوں کی مسلسل داستان کا نام ہے۔ ادھر مغلوں کے حملوں نے رہا سہا امن وامان ختم کر دیا۔ لہذا جوہ واعیان ملتان نے ۸۴۷ھ میں شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانی کے خاندان کے ایک بزرگ شیخ یوسف قریشی کو متفقہ طور پر حاکم ملتان منتخب کیا۔مگر مضافات کے ایک افغان سردار نے دھوکے سے ملتان پر قبضہ کر کے شیخ یوسف کو نکال باہر کیا اور ۸۵۵ھ میں سلطان قطب الدین کے نام سے بادشاہ ملتان ہوا۔ ۸۷۴ھ میں اُس کی وفات پر اس کا بیٹا شاہ حسین تخت نشین ہوا۔ اُس کا عہد اہل علم کی سرپرستی کے لیے مشہور ہے :

"اوبغایت قابل ومستعد بود وسزاوار درود والطاف خداوندی بود ودرایام دولت او پایۂ علم وفضل بلند شد وعلماء وفضلاء تربیت می یافتند [3]"

---

[1] تاریخ فرشتہ صفحہ ۳۴۸ [2] اخبار الاخیار صفحہ ۲۱۱ [3] طبقات اکبری صفحہ ۵۸۰

شاہ حسین نے ۹۰۸ھ میں وفات پائی اور اب تاریخ کے عام قانون کے مطابق زوال کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ اُس کا جانشین اس کا پوتا محمود شاہ ہوا جس نے جلد ہی وزیر بایزید سے بگاڑ لی۔ سلطان و وزیر کی نزاع کی وجہ سے سکندر شاہ لودھی کو ملتان کے معاملات میں مداخلت کرنے کا موقعہ مل گیا۔ اسی ہرج مرج کے زمانہ میں عماد گرویزی اپنے بیٹوں میرزا شہید اور میر شہدا کے ہمراہ ملتان آیا اور شیعیت کو پہلی مرتبہ ملتان میں رواج دیا۔ نظام الدین ہروی نے لکھا ہے:

"درخلال ایں احوال مرزا عماد گرویزی با دو پسر خود مرزا شہید و میر شہدا از جانب سیوستان بملتان آمد و دل کسے کہ مذہب شیعہ در ملتان رواج داد میر شہدا بود۔"[۱]

جام بایزید کی علماء نوازی تاریخ میں مشہور ہے۔ فرشتہ لکھتا ہے:

"و ایں جام بایزید مرد محسن و کریم النذات بودہ بر تفقد احوال علماء و رعایت صلحا مجبول بودہ۔ چنیں گویند کہ در ایام مخالفت وظائف و ادرارات علماء و صلحا در کشتیہا انداختہ از شور بملتان می فرستاد۔"[۲]

(باقی آئندہ)

سکھ مسلم تاریخ

مصنفہ ابوالامان امرتسری

سکھ تاریخ میں مسلمان بادشاہوں اور حکمرانوں کو سراپا غلط اور بے بنیاد الزام لگا کر بدنام کیا گیا ہے۔ اور بعض مورخین نے تہذیب اور اخلاق کی تمام ذمہ داریوں سے بے نیاز ہو کر مسلمانوں کی تحقیر کی ہے۔ چونکہ وہ تاریخ ایک ایسی زبان میں تھی جس سے مسلمان عام طور پر آشنا نہ تھے اس لیے وہ اس تاریخ کا صحیح رنگ میں جائزہ نہ لے سکے اور نہ ہی اس کا ازالہ کر سکے اور اسی وجہ سے یہ زہر اندر ہی اندر اپنا کام کرتا رہا۔

ابوالامان امرتسری نے ان الزاموں کو سکھ تاریخ اور حقائق کی روشنی میں بے بنیاد ثابت کر کے واضح کیا ہے کہ یہ بہت عرصہ بعد مسلمانوں کو بدنام کرنے کے لیے وضع کئے گئے ہیں۔

قیمت تین روپے آٹھ آنے

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ۔ کلب روڈ۔ لاہور